منیر احمد یزدانی
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج میرپور، آزاد کشمیر

علامہ اقبال کا تصورِ جہانِ نو: 'ضربِ کلیم' کی روشنی میں

Munir Ahmed Yazdani

Department of Urdu, Govt College, Mirpur, Azad Kashmir

Iqbal's Idea of New World:In Reference with "Zarb e Kaleem"

''Zarb e Kaleem'' is a very Important poetic presentation of Allama Muhammad Iqbal. In this book Iqbal's vision is clearly reflected in very short and strong manner.His approach and behavior about expressing the unique ideas is much note-able.In this article the discussion is about the idea of new world on the basis of "Zarb e Kaleem".

اس سے قبل کہ اُن عوامل کا جائزہ لیا جائے جن کی بنا پر علامہ اقبال نے ضربِ کلیم کو دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلام اقبال میں ضربِ کلیم کی اہمیت اور مقام پر روشنی ڈال لی جائے۔

علامہ اقبال کی چار اُردو شعری تصانیف ہیں بانگِ درا (ستمبر ۱۹۲۴ء)، بالِ جبریل (جنوری ۱۹۳۵) ضربِ کلیم (جولائی ۱۹۳۶ء) اور ارمغانِ حجاز حصہ اردو (نومبر ۱۹۳۸ء)۔

بانگِ درا کی اشاعت سے قبل تین فارسی مجموعے، اسرارِ خودی (ستمبر ۱۹۱۵)، رموزِ بے خودی (اپریل ۱۹۱۸ء) اور پیامِ مشرق (مئی ۱۹۲۳ء) شائع ہو چکے تھے۔ بانگِ درا اور بالِ جبریل کی اشاعت کے درمیان تین فارسی تصانیف زبورِ عجم (جون ۱۹۲۷ء)، جاوید نامہ (فروری ۱۹۳۲ء) اور مثنوی مسافر (۱۹۳۴ء) شائع ہو چکی تھیں۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کی اشاعت کے درمیان تقریباً ڈیڑھ برس کا وقفہ ہے اور دونوں کے درمیان کوئی فارسی اُردو، نثری یا شعری تخلیق حائل نہیں۔ ضربِ کلیم کی اشاعت سے قبل علامہ اقبال کا بیشتر اُردو اور فارسی کلام شائع ہو چکا تھا صرف مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' ستمبر ۱۹۳۶ء میں جب کہ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔

علامہ اقبال کی شعری تصانیف میں ضربِ کلیم کی اہمیت یوں بھی ہے کہ علامہ کی زندگی میں شائع ہونے والی آخری اُردو شعری تصنیف ہے کیوں کہ ارمغانِ حجاز (فارسی، اردو) نومبر ۱۹۳۸ء میں علامہ کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔

ضربِ کلیم اگرچہ جولائی ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی لیکن اس کی تخلیق و ترتیب کا آغاز ۱۹۳۴ء میں ہو چکا تھا۔ (۱)

ضربِ کلیم کا نام پہلے ''صورِ اسرافیل'' رکھا گیا۔ ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں:

> ''صورِ اسرافیل اردو کی تکمیل ابھی چند ماہ اور لے گی اگر آپ کے دوست اردو کتاب چھاپنا چاہیں تو صورِ اسرافیل کی تکمیل تک انتظار کریں''۔ (۲)

اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد دین تاثیر کو ۲۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو لکھے گئے خط میں صورِ اسرافیل کا ذکر کرتے ہیں:

''اس سال کے دوران میں اُمید ہے صورِ اسرافیل بھی ختم ہو جائے گی''۔ (۳)

بعد ازاں اس کا نام ''ضربِ کلیم'' تجویز ہوا۔ یہ تبدیلی یقیناً اس کے موضوعات، شعری آہنگ اور لب و لہجے کے پیشِ نظر کی گئی۔

ضربِ کلیم کی وجہِ تسمیہ کے بارے میں میر عبدالصمد خان نے اپنی کتاب ''خوشحال و اقبال'' میں وضاحت کی ہے اور علامہ اقبال کے ایک افغان دوست رسالدار سجید گل کے بیٹے زرین خان سے لیے گئے انٹرویو کا حوالہ دیا ہے

''ایک دفعہ رسالدار صاحب نے علامہ صاحب سے پوچھا کہ انھوں نے اپنی کتاب کا نام ''ضربِ کلیم'' کیوں رکھا ہے؟ انہوں نے فرمایا خان صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی ضرب اتنی کاری اور گہری تھی کہ ایک ہی ضرب سے فرعون غرقِ نیل ہو گیا۔ انشاء اللہ اس کتاب کا ایک ایک شعر ضربِ کاری ثابت ہوگا''۔ (۴)

ضربِ کلیم علامہ اقبال کی اہم ترین شعری تصنیف ہے۔ فکری اعتبار سے یہ علامہ کے پورے کلام پر حاوی ہے کیوں کہ اس میں ان کا پختہ عمر کا کلام شامل ہے اس لیے قدرتی طور پر اس میں خیالات کی گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے۔ اس میں نہایت مختصر مگر فکر انگیز انداز میں دورِ حاضر کے مسائل پر جدید رجحانات کی روشنی میں بحث کی ہے اور عالمی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کو اسلامی نقطہ نظر سے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ضربِ کلیم کی مختصر اور چھوٹی چھوٹی نظمیں اپنے اندر معانی کا سمندر لیے ہوئے ہیں۔ اُردو اور فارسی شعری ادب میں اتنی جامع، متنوع اور گہرائی و گیرائی کی حامل تخلیق نہیں ملتی۔ اس طرح یہ کتاب علامہ اقبال کی زندگی کا نچوڑ اور ان کی بالغ نظری کا ثبوت ہے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کتاب کا نام 'ضربِ کلیم' رکھنے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کا 'ضربِ کلیم' نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ علامہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو اشعار ہیں یا با الفاظ صحیح تر ان اشعار میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ عصرِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں ''ضربِ کلیم'' کا اثر رکھتے ہیں اور علامہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں جس کی بدولت وہ دورِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں''۔ (۵)

دراصل علامہ اقبال نے ضربِ کلیم میں ان تمام موضوعات کا احاطہ کیا ہے جن پر وہ اپنی شاعری یا نثر میں اب تک اظہارِ خیال کر چکے تھے یعنی ان کے افکار و نظریات کا خلاصہ ہمیں ضربِ کلیم میں مل جاتا ہے۔ ان نغموں میں توحیدِ الٰہی، خودی کی حفاظت و استحکام اور تربیت کے عوامل، عشق، فقر، تسلیم و رضا اور جہاد جیسے بنیادی تصورات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت، مومن اور شاہین کی صفات، آزادی اور غلامی کا موازنہ اور غلامی کے مضر اثرات، اتحادِ عالمِ اسلام کی ضرورت جیسے اہم اور فوری نوعیت کے مسائل پر علامہ نے مسلمانوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں ۱۲ اگست ۱۹۳۶ء کو راس مسعود کو لکھے گئے ایک خط میں فرماتے ہیں:

''باقی رہی کتاب سو یہ ایک Topical چیز ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ بعض خاص خاص مضامین پر میں اپنے خیالات کا اظہار کروں جیسا کہ اس نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اعلانِ جنگ ہے زمانہ حاضر کے نام اور ''ناظرین'' سے میں نے خود کہا ہے کہ ''میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ'' نوائے چنگ یہاں موزوں نہیں ہے اس کتاب کا Realistic ہونا ضروری ہے اور نوائے چنگ کی تلافی Epigrammatic Style سے کی گئی ہے''۔ (۶)

اسی طرح خواجہ غلام السیدین کو ۲۱ جون ۱۹۳۶ کو لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں

''ضربِ کلیم امید ہے جون کے آخر تک شائع ہو جائے گی اور میں آپ کو ایک نُسخہ پیشگی بھیج سکوں گا۔ اس مجموعہ میں ایک حصہ تعلیم و تربیت کے لیے وقف ہے ممکن ہے آپ کو اس میں کوئی نئی بات نظر نہ آئے تاہم اگر کتاب آپ کو بروقت مل جائے تو محولہ بالا حصہ ضرور مطالعہ فرمایئے گا''۔ (۷)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود علامہ کی نظر میں 'ضربِ کلیم' کتنی اہمیت کی حامل ہے۔ ضربِ کلیم کی اشاعت کے بعد ۲۲ اگست ۱۹۳۶ء کو ''انقلاب'' میں ضربِ کلیم سے متعلق ایک اداریہ لکھا گیا۔ اس اداریے سے ضربِ کلیم کی نظموں کے موضوعات کی اہمیت اور فکرِ اقبال میں ضربِ کلیم کے مقام کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ حضرت علامہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف ہے جس میں دو سو کے قریب جدید منظومات فراہم کی گئی ہیں۔ غالباً دورِ حاضر کا کوئی مسئلہ ایسا نہ ہوگا جس پر ضربِ کلیم میں علامہ نے اپنے انداز میں مختصر لیکن جامع تبصرہ نہ کر دیا ہو۔ یوں تو آپ بالِ جبریل میں بھی شاعر کم اور مفکر و معلّم زیادہ ہیں لیکن ضربِ کلیم میں تو تعلیم خودی کی تلوار بہت ہی زیادہ سان پر چڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور اکثر مطالب بے تکلف اور عُریاں طور پر بیان ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کہن سالی، تجربہ کاری اور پختگیِ فکر و خیال کے باعث۔۔۔ جو کونین پہلے شکر میں لپٹی ہوئی تھی اب بے شکر ہے اور اسی وجہ سے تلخ بھی معلوم ہوتی ہے''۔ (۸)

دورِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ:

کتاب کے سرورق پر ''ضربِ کلیم'' عنوان کے نیچے لکھا ہے ''یعنی اعلان جنگ، دورِ حاضر کے خلاف'' اور بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی ''سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب پر اتنے مختصر لفظوں میں اس سے بہتر تبصرہ ممکن نہیں ہے جس کو شک ہو اسے لازم ہے کہ کتاب کا اول سے آخر تک مطالعہ کرے یقیناً اس تبصرہ کی صداقت آشکار ہو جائے گی''۔ (۹)

دورِ حاضر علامہ اقبال کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کے لیے انھوں نے زمانہ حاضر، عصرِ حاضر تہذیبِ حاضر تہذیبِ فرنگی، تہذیب نوی کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ دورِ حاضر میں بہت کچھ شامل ہے مثلاً مغربی سامراجیت اور اس کا استبدادی نظام، سرمایہ داری، ملوکیت، جمہوریت، اشتراکیت، مغربی فکر و فلسفہ اسی طرح الحاد، تشکیک، مذہب سے دوری، ناانصافی، استحصال، اخلاق باختگی، عریانی، بے حجابی، نسلی اور تہذیبی تفاخر وغیرہ۔

علامہ اقبال نے اس ''دورِ حاضر'' کے خلاف فکری محاذ پر ضربِ کلیم کی صورت میں اعلان جنگ کیا لیکن علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور اخلاقی حالات کا تقاضا تھا کہ عملی محاذ پر بھی اعلان جنگ کیا جائے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

؎ جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زُجاج نہ ہو سکے گا حریفِ سنگ
یہ زوردست و ضربت کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ (۱۰)

اعلان جنگ دورِ حاضر کے خلاف..... اس طبل جنگ کے پسِ منظر اور عوامل کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں علامہ اقبال کے پہلے سفر یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے ان کے افکار پر اثرات کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ جب انہوں نے مغربی استعماری اور استحصالی ہتھکنڈوں کو بنظرِ غائر دیکھا۔ اس عرصہ میں علامہ اقبال میں جو اہم انقلاب آیا وہ ان کا مغربی تصورات سے متنفر ہو کر ذہنی و قلبی طور پر اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنا تھا اور انہوں نے مغربی تہذیب و افکار کا گہری

نظر سے مطالعہ کر کے شدت کے ساتھ اسے ہدفِ تنقید بنایا اور مغربی تہذیب کے مُضر اثرات کو کھول کر بیان کیا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دُکان نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازُک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا (۱۱)

مغربی تصورِ وطنیت پر کُھل کر چوٹ کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک یہی وہ سیاسی تصور ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا اس لیے علامہ اقبال نے اس تصور کی شدید مذمت اور مخالفت کی:

یہ بُت کہ ترا شیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گر کا شانہ دینِ نبویؐ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ فطرت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے (۱۲)

اس طرح یہ حقیقت واضح ہے کہ یورپ جانے سے قبل کے اقبال اور یورپ سے واپس آنے والے اقبال کے افکار میں نمایاں تبدیلی آ چکی تھی۔ اس کے بعد طرابلس کی جنگ (۱۹۱۱ء) اور جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۹ء) کے حالات و واقعات نے علامہ اقبال کے ذہن میں دورِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ کے محرکات کا کام کیا۔ برصغیر کے سیاسی حالات اور مسلمانوں کی غلامی نے بھی علامہ اقبال کو عالمی استعماری طاقتوں سے متنفر کر دیا۔ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء)، سائمن کمیشن (۱۹۲۷ء) گول میز کانفرنسز (۱۹۳۰ء۔۱۹۳۲ء) اور بعد کے حالات و واقعات کا موازنہ ضربِ کلیم کی نظموں کے موضوعات سے کیا جائے تو ساری کتاب دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ دراصل علامہ اقبال کے نظامِ فکر میں تعمیرِ انسانیت اور تکمیلِ آدمیت کو بڑا دخل حاصل ہے اور وہ ایک فلاحی اسلامی معاشرے کے ذریعے انسانیت کی بقا کا سامان کرنا چاہتے ہیں جب کہ استعماری طاقتیں انسانیت کی تذلیل کے نئے نئے ہتھکنڈے اختیار کرتی ہیں۔ اس طرح یہ بات بالکل درست ہے کہ علامہ کے ذہنی اور فکری جہاں اور حقیقی انسانی جہاں میں تفاوت تھا۔ ان دونوں کو مماثل کرنے کے لیے تصادم لازمی تھا۔ وہ نکات جو ضربِ کلیم سے پہلے یا بعد بسیط انداز میں تھے ضربِ کلیم میں تحدید کے ساتھ در آئے۔ ان کے چاہنے اور نہ چاہنے میں تصادم ہوا اسی لیے یہ کتاب ''اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف'' بن گئی۔ (۱۳)

نظمِ عالم سے بے زاری کی وجوہات:

انسانی معاشرے کی ترقی اور بقا کے لیے ایک مربوط نظام ہائے زندگی کی ضرورت ہے جس میں دینی اور روحانی اقدار اور عقائد، سیاسی اور معاشرتی قوانین اور اقتصادی نظام شامل ہیں۔ یہ سب آپس میں باہم مربوط ہیں اور ایک دوسرے نظام کو مضبوط کرتے ہیں۔ اقبال کے ہاں انسان کی ترقی، بقا اور ترویج کے لیے خودی بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور خودی کی مضبوطی کے لیے دینِ اسلام کے قواعد و ضوابط اور شعائرِ اسلام کی پابندی، رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل، پر زور دیتے ہیں: ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناری برگساں نہ ہوتا!
ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اس کا طلسم سب خیالی!
محکم کیسے ہو زندگانی؟ — کس طرح زندگی ہو لازمانی؟

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دیں مسلک زندگانی کی تقویم دیں سرِّ محمد ﷺ و براہیمؑ (۱۴)

نظم عالم سے بے زاری کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو علامہ کے ہاں صرف ایک بنیادی وجہ ہے وہ یہ کہ جب معاشرہ لادینیت کی دلدل میں گر جائے تو اس کا زوال یقینی ہے بلکہ کوئی معاشرتی، سیاسی، اقتصادی نظام دین کی حدود و قیود سے باہر نکلا تو تباہی اس کا مقدر بن گئی۔ اسی لیے دین و سیاست کو انہوں نے کبھی جُدا نہیں سمجھا۔ جبکہ آج کل سیاست، منافقت اور ''حکمتِ عملی''، مصلحت کا نام ہے۔

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۱۵)

جن نظام ہائے زندگی سے علامہ اقبال متنفر اور بے زار تھے ان میں سیاست، آمریت، ملوکیت، جمہوریت، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام شامل ہے۔ ضربِ کلیم کے موضوعات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال کے ان نظمِ عالم کے بارے میں نظریات کا مختصر جائزہ پیش ہے:

سیاست:

آج کے دور میں میکاولی کو مغرب کی جدید لادین سیاست کا امام مانا جاتا ہے جو منافقت اور مکر و فریب کو بہترین نظامِ حکومت کا حصہ قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اقوام عالم نے اس اندازِ سیاست کو ناپسند کیا ہے لیکن حقیقت میں سب اس کی پیروی کر رہے ہیں اور حکمت عملی کے نام پر حیلہ سازی، جھوٹ، فریب اور منافقت کو عقل مندی اور دانش کا نام دیا جا رہا ہے۔ علامہ اس اندازِ فکر کو پسند نہیں کرتے اور لادین نظریہ سیاست کو عالمِ انسانیت کے لیے تباہی قرار دیتے ہیں۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دین
کنیزاَ ہرمن و دوں نہا دو مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر (۱۶)

نظم ''دین و سیاست''(۱۷) میں جدید نظریہ سیاست پر چوٹ کی ہے اور دین و سیاست کی علیحدگی کو ''چشم تہذیب کی نابصیری'' قرار دیتے ہیں۔ اس طرح علامہ اقبال دورِ جدید کے تمام سیاسی نظاموں کو خواہ وہ ملوکیت، فسطائیت اور آمریت ہوں یا جمہوریت اور اشتراکیت، عالم انسانی کے لیے فلاح اور امن کا ذریعہ نہیں سمجھتے اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔

ملوکیت:

ملوکیت ایسا نظام حکومت ہے جو انسانی فطرت کے خلاف ہے کیوں کہ ایک بدکردار بادشاہ کا بیٹا ہونے کی وجہ سے قوم کی تقدیر کا مالک بن جاتا ہے۔ اقبال اسے انسانیت کے لیے مضر سمجھتے ہیں۔

فطرت کو گوارہ نہیں سلطانیء جاوید
ہر چند کہ یہ شعبدہ بازی ہے دل آویز (۱۸)

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو سے علامہ اقبال کا سالِ نو کا پیغام نشر ہوا۔ اس میں انہوں نے ملوکیت کو ہدف بنایا:

''(ملوکیت) اپنے چہرے پر جمہوریت، وطنیت، کیمونزم، فاشزم اور خدا جانے کس کس قسم کے مصنوعی چہرے سجائے ہر طرف دندناتی پھرتی ہے۔۔۔ان مصنوعی چہروں کے سائے تلے، دنیا کے ہر گوشے میں

حریت اور شرفِ انسانی کی روح کو اس طرح پاؤں تلے روندا جا رہا ہے کہ انسانی تاریخ کا تاریک ترین دور بھی اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے''(۱۹)

جمہوریت:

جمہوریت ایک دلکش طرز حکومت ہے۔ جس کے بارے میں کیا مغرب کیا مشرق تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے۔ اس میں جو اصول وضع کیے گئے ہیں وہ واقعی دل خوش کن ہیں۔ مثلاً عوام کی حاکمیت، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، نیشنلزم، پارٹی سسٹم، لیکن علامہ اس طرز حکومت کو دور اندیش اور عقل مندوں کی حکومت نہیں سمجھتے۔ اسی لیے مغربی جمہوریت سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔

گریز از طرز جمہوری، غلام پختہ کار شو
کہ از مغز دو صد خر، فکر انسانی نمی آید (۲۰)

اور یہ کہ

جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (۲۱)

علامہ کے نزدیک وہ سیاست جو دین سے آزاد ہو وہ عالم انسانیت کے لیے ایک لعنت ہے۔ ایسی سیاست کی حامل قوم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دور جدید کی جمہوریت صراطِ مستقیم سے دور ہے اس لیے علامہ عہدِ حاضر کے سیاسی پیشواؤں کے متعلق لکھتے ہیں:

اُمید کیا ہے سیاست کے پیشواؤں سے
یہ خاک باز ہیں، رکھتے ہیں خاک سے پیوند (۲۲)

اس طرح جمہوریت کے اصولوں میں لبرل ازم، سرمایہ داری، قوم پرستی جیسے دلفریب نعرے تو ہیں لیکن پس منظر میں بھیانک تصویریں ہیں جسے اقبال نے قوموں کے لیے زہر قاتل قرار دیا ہے۔

اشتراکیت:

ملوکیت کے ردعمل کے طور پر جمہوریت وجود میں آئی اور مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ردعمل میں اشتراکیت وجود میں آئی جو کہ ایک سیاسی اور معاشی نظام کی حیثیت سے اہمیت کی حامل ہے۔ اشتراکیت دراصل مزدوروں کی فلاح اور عوام کو ضروریاتِ زندگی کی فکر سے آزاد کرنے کا نظام تھا۔ لیکن یہ بھی لادین اور اخلاق باختگی کے اصولوں پر مبنی نظامِ سیاست اور معیشت ہے۔ اسی لیے اقبال اس نظام کو بھی چنگیزیت اور قیصریت کے استبدادی ہتھکنڈوں سے لیس سمجھتے ہیں۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کُن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی (۲۳)

علامہ اقبال کے خیال میں اشتراکیت کے کچھ اصول اسلام کے مطابق ہیں لیکن اس کے لادینی پہلو کو وہ پسند نہیں کرتے۔ ۱۹۲۳ء میں ''پیامِ مشرق'' کی اشاعت کے بعد چند فارسی نظموں اور ''خضر راہ'' کو بنیاد بنا کر علامہ کو چند اشتراکیت پسندوں نے اشتراکی ثابت کرنے کی کوشش کی تو علامہ نے ''زمیندار'' کے مدیر کو ایک خط لکھا۔ فرماتے ہیں:

''چونکہ بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہوجانے کے مترادف ہے اس واسطے اس تحریر کی تردید کرنا میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں، میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور بالشوزم دونوں افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں، اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہمیں بتائی ہے۔''۔ (۲۴)

اشتراکیت کے بارے میں علامہ اقبال خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔۔۔ جو روحانیت میرے نزدیک مضر ہے یعنی افیونی خواص رکھتی ہے اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اُٹھایا ہے''(۲۵)

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال پروفیسر آل احمد سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک فاشزم، کیمونزم یا زمانہ حال کے اور ازم، کوئی حقیقت نہیں رکھتے، میرے عقیدے کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہ نگاہ سے موجب نجات ہوسکتی ہے۔''(۲۶)

جیسا کہ اس سے قبل بیان ہوا ہے کہ نظم عالم سے بے زاری کی بنیادی وجہ لادینیت ہے۔ اس کے علاوہ اختیار وآزادی کا فقدان اور لذت پرستی بھی شامل ہیں۔

i- تشکیک ولادینی:

دراصل موجودہ دور میں انسان محسوسات کی دنیا کو حقیقت سمجھتا ہے اور یوں آج کا انسان عملاً دین وایمان سے محروم ہے۔ اس کی نظر میں مذہب ایک جنون خام ہے اور ہستی غائب کی تلاش والے احمق ہیں جبکہ علامہ اقبال کے نزدیک جب قلب سے عشق وایمان رخصت ہوجائے تو تاریکی چھا جاتی ہے۔ ان کے خیال میں انسان روشن دماغ تو ہے لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی اور عفت ختم ہوچکی ہے۔

اے مسلمانان فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب (۲۷)

ii- اختیار وآزادی کا فقدان:

جبریت کے زیر اثر مغرب کا تمام نظام انسانیت کی تذلیل کا باعث بنتا ہے اور انسان اختیار اور آزادی کے فقدان کے باعث اپنی صلاحیتوں کے استعمال سے گریزاں ہے۔

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ وپے میں فقط مستی کردار (۲۸)

جبر کے عقیدے اور تعلیم نے مسلمان کو عمل سے محروم کردیا۔ غلام قوموں کا خمیر مردہ ہوجاتا ہے اور ایسا ہی ہوا!

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (۲۹)

اقبالؔ کے ذہن میں جہانِ نو کا تصور:

یہ بات تو طے ہے کہ علامہ اقبال جہان نو اور تازہ بستیاں آباد کرنے کے حق میں تھے اور آئین نو کی تشکیل کے حامی تھے۔ جب دنیا میں معاشرتی اور سیاسی نظام توڑ پھوڑ کا شکار ہوں تو یقیناً اقبال جیسا مفکر ایک ایسے نظام اور اس نظام کے تحت قائم معاشرے کا تصور پیش کرے گا جو انسانوں کے لیے فلاح اور امن کا داعی ہو۔

علامہ اقبال ایک مسلم مفکر ہیں ان کے نزدیک تمام معاشرتی اور سیاسی نظام باطل ہیں اور صرف اور صرف اسلام ہی مکمل ترین نظام ہائے زندگی پیش کرتا ہے۔ اسلام میں نہ ملوکیت ہے، نہ آمریت اور نہ مغربی جمہوریت کا تصور ہے بلکہ اشتراکیت اور فاشزم کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ اقبال نے نظامِ زندگی کی وضاحت اپنے الہ آباد کے مشہور خطبے میں یوں کی ہے:

> ''آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کو خطاب کرنے کے لیے آپ نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو اسلام سے بحیثیت ایک ایسی زندہ قوت کے مایوس نہیں ہوا جس میں انسانی زاویہ نگاہ کو اس جغرافیائی حد بندیوں سے آزاد کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ مذہب افراد اور ریاستوں کی زندگی میں انتہائی اہمیت کی قوت ہے اور آخر میں جو یہ یقین رکھتا ہے کہ اسلام خود تقدیر ہے اور کسی دیگر تقدیر کے تابع نہیں ہوسکتا.....لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے تخلیق کردہ سماجی نظام سے ایک نامیاتی نسبت رکھتا ہے ایک کے رد کرنے سے دوسرے کا استرداد بالآخر لازم آئے گا''۔ (۳۰)

ارمغان حجاز کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں بھی ابلیس اپنے مشیروں تک یہی پیغام پہنچاتا ہے کہ ملوکیت، جمہوریت، آمریت، اشتراکیت اور فسطائیت سے مراد ابلیسی نظام ہی ہے۔ یہ سب وہی طریقے اور ہتھکنڈے ہیں جن کی مدد سے وہ اپنا ابلیسی نظام دنیا میں رائج رکھے ہوئے ہیں ان میں جو تبدیلی آ رہی ہے وہ میرے وضع کردہ نظام کے لیے زیادہ خطرناک نہیں اگر میرے نظام کو خطرہ ہے تو اسلام اور امتِ مسلمہ سے ہے۔ اگرچہ یہ امت نفاق کا شکار ہے اگر اسے کوئی کامل رہنما مل جائے تو ہمارے بنائے گئے نظام کو درہم برہم کرسکتی ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنہء فردا نہیں اسلام ہے (۳۱)

علامہ اقبال کے نزدیک عالم انسانیت کی بقا اور روشن مستقبل کی ضمانت صرف اور صرف اسلام میں پوشیدہ ہے۔

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری (۳۲)

حوالہ جات

۱۔ بیاض ''ضربِ کلیم'' کے آغاز میں علامہ اقبال نے لکھا ہے ''آغاز ۳۴ء''

۲۔ نذیر نیازی، سید، مرتب وتحشیہ، مکتوباتِ اقبال بنام نذیر نیازی، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص: ۲۷۰

۳۔ بشیر احمد ڈار، مرتب، انوارِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ص: ۲۰۵، ۲۰۶

۴۔ میر عبدالصمد خان، خوشحال و اقبال، علیم پبلشنگ ہاؤس، پشاور، ۱۹۸۲ء، ص: ۵۱

۵۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح ضربِ کلیم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۰

۶۔ عطااللہ، شیخ، مرتب، اقبال نامہ (یک جلدی) اقبال اکادمی، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ص: ۲۸۵، ۲۸۶

۷۔ ایضاً، ص: ۲۴۰، ۲۴۱

۸۔ محمد حمزہ فاروقی، مرتب، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، جامعہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۸ء، ص: ۹۷

۹۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، کتابِ مذکور، ص ص: ۸، ۹

۱۰۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۸۲

۱۱۔ ایضاً، ص: ۱۴۰ ۱۲۔ ایضاً، ص: ۱۶۰، ۱۶۱

۱۳۔ محمد منور، مرزا، میزانِ اقبال، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ص: ۱۸۹، ۱۹۰

۱۴۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص: ۴۸۰

۱۵۔ ایضاً، ص: ۳۳۲ ۱۶۔ ایضاً، ص: ۴۱۴، ۴۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص: ۴۱۰ ۱۸۔ ایضاً، ص: ۶۱۰

۱۹۔ لطیف احمد خان شیروانی، مرتب ومترجم، حرفِ اقبال، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۱۷

۲۰۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۳۰۵

۲۱۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص: ۱۴۹

۲۲۔ ایضاً، ص: ۶۱۹ ۲۳۔ ایضاً، ص: ۳۳۲

۲۴۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، مرتب، خطوطِ اقبال، مکتبہ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ص: ۱۵۵، ۱۵۶

۲۵۔ عطااللہ، شیخ، کتابِ مذکور، ص: ۲۴۳

۲۶۔ ایضاً، ص: ۵۷۹، ۵۸۰

۲۷۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال فارسی، ص: ۴۸۷

۲۸۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص: ۵۰۲

۲۹۔ ایضاً، ص: ۴۷۸

۳۰۔ لطیف احمد خان شیروانی، کتابِ مذکور، ص ص: ۲۳، ۲۴

۳۱۔ محمد اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال اُردو، ص: ۶۵۴

۳۲۔ ایضاً، ص: ۴۱۰